اقبال اور مسلم ہندی قوم پرستوں کے تحفظات

ڈاکٹر ایوب صابر

بیسویں صدی میں اسلامیانِ ہند کے رہنماؤں میں تین نام بہت نمایاں ہیں: علامہ محمد اقبال، محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد۔ ان تینوں شخصیات نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق مسلم امت کی رہنمائی کی۔ مسلم قومیت کے حوالے سے ان کے نقطہ ہائے نگاہ میں اختلاف تو رہا لیکن تینوں ایک دوسرے کے لیے نرم گوشہ رہے۔ اس عرصے کی جدوجہد میں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسین احمد مدنی بھی اقبال سے مختلف نقطۂ نگاہ رکھتے ہوئے شریک رہے، لیکن اس اختلاف میں جذبات کا دخل زیادہ رہا۔ اقبال کے ساتھ ان شخصیات کا اختلاف کس حد تک درست تھا حالات نے اس کا فیصلہ اقبال کے حق میں دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس فیصلے کے بعد بھی اقبال پر اعتراضات کا سلسلہ بند نہ ہوا، اقبال کے موقف کو غلط ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے تراشے گئے۔

علامہ اقبال، محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد بیسویں صدی کے آسمان پر طلوع ہونے والے اسلامیانِ ہند کے درخشندہ ترین ستارے تھے۔ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں امتِ مسلمہ کے موضوع پر علی گڑھ کالج میں خطبہ پڑھا۔[1] وہ اپنی بے مثل شاعری سے زوال و جمود کا شکار مسلم قوم کو بیدار کر رہے تھے۔ محمد علی جوہر نے ۱۹۱۰ء میں کامریڈ نکالا۔ ابوالکلام کے الہلال کا آغاز ۱۹۱۲ء سے ہوا۔ محمد علی نے ۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک شروع کی جو بہت بڑی تحریک تھی۔ ابوالکلام آزاد اس میں پوری طرح شریک تھے۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں ساتھ ساتھ چلیں۔ دونوں کی مجموعی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ اس دوران انگریز دشمنی کے جذبات کو فروغ حاصل ہوا اور ہندو مسلم اتحاد کی گہری روایت قائم ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی نے تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔[2] جس سے مسلمان بہت مایوس ہوئے اور ہندو مسلم فسادات کے باعث اتحاد کا تصور بھی گہنا گیا۔ محمد علی اور ابوالکلام کے راستے بھی جدا ہونے لگے۔ ابوالکلام نے ۱۹۱۳ء میں 'حزب اللہ' قائم کی تھی اور تب سے ان کی امامت پر بیعت کا سلسلہ جاری تھا۔[3] وہ 'امام الہند' بننا چاہتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ محمد علی جوہر ان کے سب سے بڑے حریف تھے۔[4] آزاد نے امامت کا خیال ترک کر کے

خالص سیاسی راستہ اپنا لیا اور کانگرس کے چوٹی کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ انھوں نے جب پہلی مرتبہ کانگرس کے اجلاس کی صدارت کی تو ان کی عمر صرف ۳۵ سال تھی۔[۵]

علامہ اقبال نے تحریکِ خلافت میں سرگرم حصہ نہ لیا اور ترکِ موالات کو مضر تصور کیا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے حامی لیکن متحدہ ہندی قومیت کے مخالف تھے۔ خلافت اور ترکِ موالات کی متحدہ تحریک متحدہ ہندی قومیت کی داغ بیل ڈال رہی تھی۔ علی گڑھ تحریک انگریز دوستی کا مظہر تھی لیکن حسرت موہانی اور محمد علی جیسے بت شکن علی گڑھ ہی کے پروردہ تھے۔ ترکِ موالات کی رو میں محمد علی نے علی گڑھ کے مقابلے پر جامعہ ملیہ قائم کی جس کے مقاصد میں ہندوستانی متحدہ قومیت شامل تھی۔[۶] جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرح جمعیت العلمائے ہند بھی اسی دور میں قائم ہوئی اور متحدہ ہندی قومیت کی علمبردار بنی۔ الگ مسلم قومیت کا تصور اقبال نے اپنی منظومات بعنوان 'وطنیت'، 'ترانہ ملّی' اور 'جوابِ شکوہ' نیز خطبۂ علی گڑھ اور رموزِ بے خودی میں پیش کیا تھا۔ اقبال نے وضاحت کی کہ مسلم قومیت کا انحصار وطن، نسل یا اقتصادی اغراض پر نہیں ہے، خود اسلام پر ہے۔ یہ آواز منفرد اور ممتاز تھی اور اس نے مسلم سیاست کا رخ متعین کر دیا۔ ہندی اُردو نزاع کے باعث سرسید نے بھی مسلم قوم کو ہندو قوم سے الگ تصور کیا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ علی گڑھ یونی ورسٹی مسلم قومیت کی علمبردار اور تحریکِ پاکستان کا مرکز جبکہ جامعہ ملیہ متحدہ ہندی قومیت کا محور بنی۔ قومیت کے مسئلے پر محمد علی نے اقبال پر تنقید کی۔ محمد علی اسلامی قومیت اور ہندی قومیت دونوں کے علمبردار تھے۔ مسئلہ قومیت پر مولانا مدنی اور اقبال کے مابین زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ ابوالکلام اور اقبال کا براہِ راست ٹکراؤ نہ ہوا۔ دونوں بڑوں نے اس سے پہلو تہی کی۔[۷] حالانکہ خالص ہندوستانی قومیت کے سب سے بڑے علمبردار ابوالکلام ہی تھے۔ انھوں نے وحدتِ ادیان کا موقف اختیار کیا اور اس سے متحدہ ہندی قومیت کے تصور کو تقویت پہنچائی۔ مولانا مدنی اتنا آگے نہیں جا سکتے تھے۔ انھوں نے اسلامی حوالہ تلاش کیا اور 'میثاقِ مدینہ' کو متحدہ قومیت کا جواز بنا کر پیش کیا۔[۸] اسلام بہرحال ان کی زندگی پر حاوی تھا۔ مولانا محمد علی کی شیفتگیِ اسلام بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ تاہم وہ دو دائروں کے اسیر تھے، ایک اسلامی اور دوسرا ہندوستانی۔ انھوں نے اپنی آخری تقریر [۱۹۳۰ء] میں یہی بات، زور دے کر کہی۔[۹] ابوالکلام آزاد بھی اس طرح کی باتیں کرتے تھے لیکن ان کی سیاست ان کے مذہب پر حاوی ہو چکی تھی۔ انھوں نے درحقیقت تصورِ قومیت کو غیر دینی بنیادوں پر استوار کیا اور سب سے بڑے نیشنلسٹ مسلمان رہ نما کے طور پر نمایاں ہوئے۔ ان کے ایک پیروکار مشیر الحسن لکھتے ہیں:

> ابتدائی دنوں میں ان کا تناظر قرآن، حدیث اور اسلام کی عظیم روایات سے متعین ہوا تھا۔ بعد میں یہ صورت نہیں رہی۔ اب انھوں نے یہ استعداد پیدا کر لی کہ خالص سیاسی مسائل پر غور یا گفتگو کرتے ہوئے غیر

ضروری مذہبی مصالح سے قطع نظر کرلیں۔ رفتہ رفتہ وہ غیر دینی قومیت کی نظریاتی بنیادوں کی طرف بڑھتے چلے گئے اور مسلمانوں میں اس کے سب سے اہم ترجمان بن گئے۔[۱۰]

۲

ابوالکلام آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کی تلقین الہلال کے پہلے پرچے میں بھی کی تھی۔[۱۱] تاہم وہ دو قوموں کے اتحاد کی بات تھی جو بہرحال 'ہندو مسلم متحدہ قومیت' سے مختلف ہے۔ تب ابوالکلام مقامی وطنی نقطۂ نظر کے خلاف تھے اور عالمگیر اسلامی تحریک کے حامی تھے۔ چنانچہ الہلال کے اجرا کے تھوڑے عرصے بعد، خواجہ حسن نظامی کو، ایک خط میں لکھتے ہیں:

آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی.... جب تک تمام دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی اور عالمگیر تحریک نہیں ہوگی، زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔[۱۲]

۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے اجلاسِ عام، بمقام کلکتہ، میں خطاب کرتے ہوئے ابوالکلام نے کہا:

یہ برادری [مسلم قوم یا ملتِ اسلامیہ] خدا کی قائم کی ہوئی ہے۔ ہر انسان جس نے کلمۂ لا الٰہ الا اللّٰہ کا اقرار کیا، اس برادری میں شامل ہوگیا۔ خواہ مصری ہو، خواہ نائجیر یا کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے جس کا گھرانا کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔[۱۳]

آگے چل کر ابوالکلام نے وطنی مقامی نقطۂ نظر اختیار کرلیا۔ خدا کی قائم کی ہوئی اسلامی برادری کے بجائے ہندوستانی قومیت کو قدرت کا اٹل فیصلہ قرار دے دیا۔ یہ تبدیلی گاندھی سے ملاقات [۱۹۲۰ء] کے بعد آئی۔ ۱۹۴۰ء میں کانگرس کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبے میں کہا:

ہماری ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے۔[۱۴]

ہندو اور مسلمان ہزار برس کی مشترک زندگی کے باوجود الگ الگ قومیں تھیں۔ ابوالکلام کا موقف درست نہیں تھا۔ درست نظریہ وہی تھا جسے اقبال نے پیش کیا اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۸ء تک مسلسل اس کی آبیاری کی۔ علامہ اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے اکابر نیشنلسٹ علما کا سحر توڑ دیا۔ ہندی مسلمانوں نے اُن کی بات رد کردی اور اقبال کے نظریے کو اپنا لیا۔ پاکستان کی تجویز جب کانگرس نے بھی مان لی تو ابوالکلام بہت مایوس ہوئے اور جب ان کے آخری سہارے، گاندھی نے بھی اس

تجویز سے اتفاق کر لیا تو ان کے صدمے کی انتہا نہ رہی۔[۱۵]

'خاندانِ توحید' کے لیے اپنی جملہ توانائیاں صرف کر کے ابوالکلام 'امام الہند' بن سکتے تھے لیکن وہ اسلام کی متحد کرنے والی قوت ہی کا انکار کرنے لگے تھے۔[۱۶] شیخ محمد اکرام نے ابوالکلام کے وسیع مطالعے، تیز نظر، ذہانت اور مذہبی جوش کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان میں مذہبی تجدید کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں لیکن انھیں انتہائی بلندی پر پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ وہ شاہ ولی اللہ جیسا مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ شیخ محمد اکرام نے خود ابوالکلام کی زبانی بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ ''سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں''۔[۱۷] ابوالکلام کی بات درست ہے تاہم اس المیے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ابوالکلام عالمگیر اسلامی قومیت کا تصور ترک کر کے وطنی قومیت پر فدا ہو گئے اور ان کے نقطۂ نظر نے عملاً سیکولرازم کا راستہ ہموار کیا۔[۱۸] اسلامی احیا کے لیے اپنی استعداد کو وقف کر کے وہ شاہ ولی اللہ کا سا مقام حاصل کر سکتے تھے لیکن اپنی معروف سیاست اور اسلامی فکر میں تنزل کے باعث ان کے دینی مرتبے کو ضعف پہنچا، یہاں تک کہ کلکتہ کے مسلمانوں نے ان کی امامت میں نماز عید پڑھنا ترک کر دیا تھا۔[۱۹]

علامہ اقبال نے، براہِ راست، کبھی ابوالکلام کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا تھا، نہ ابوالکلام نے کبھی ایسا کیا۔ محمد علی جوہر اقبال کے مداح اور ارادت مند تھے لیکن پوری طرح اقبال کی پیروی نہ کی بلکہ وطنی قومیت کے جوش میں اقبال کے خلاف، یکے بعد دیگرے، پانچ مضامین لکھ کر شائع کر دیے۔ جامعہ ملیہ کے اہلِ علم و دانش نے محمد علی کی روایت کو، ایک حد تک، زندہ رکھا ہوا ہے اور اقبال پر اعتراضات کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ مولانا مدنی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال کے خلاف ایک رسالہ بعنوان متحدہ قومیت اور اسلام تصنیف کیا جس میں ''متحدہ قومیت'' کے لیے اسلامی دلائل فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے 'معرکۂ دین و وطن' کا آغاز ہو چکا تھا۔ دیوبندی مسلک کے وہ علما جو مولانا مدنی سے ارادت مندی کے باعث قیامِ پاکستان کی مخالفت کو بھی روا رکھتے ہیں، علامہ اقبال کو سخت تنقید و اعتراضات کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ ابوالکلام کے اثرات علما سمیت ہندی قوم پرست مسلمانوں بلکہ ہندوؤں تک وسیع ہیں۔ ان کا بھارت کی تاریخ میں بھی ایک مقام ہے، اگرچہ وہ صدر یا وزیرِ اعظم نہ بنائے گئے البتہ جس طرح علامہ اقبال کا مقبرہ شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں ہے، اسی طرح ابوالکلام کا مزار جامع مسجد دہلی کے سامنے واقع ہے۔ ہندی قوم پرست مسلمان رہ نما کی حیثیت سے ان کا کردار مرکزی تھا۔

ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور مولانا حسین احمد مدنی کے اثرات برابر کام کر رہے ہیں۔ ہندی وطنی قومیت کی حمایت اور علامہ اقبال کے خلاف مہم جاری ہے۔ متحدہ قومیت کے حامی، پاکستانی علما کو دشواریوں کا سامنا ہے۔ دراصل ان کا بنیادی مسئلہ مولانا مدنی کا دفاع ہے۔، اقبال شکنی کی مہم اسی وجہ سے جاری ہے

البتہ بھارت میں قوم پرست علما اور دانش ور ہندی قوم پرستی کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اقبال پر ان کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ اقبال نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی تشکیل کا ذہن بنایا۔[۲۰]

۳

مولانا محمد علی بہت جذباتی انسان تھے۔ بقول مولوی عبدالحق وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ وہ بہت محبت اور ایثار کرنے والے تھے لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہوجاتے تھے کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔[۲۱] علامہ اقبال کو اپنا استاد مانتے تھے اور ان سے محبت کرتے تھے لیکن ترکِ موالات، مسئلہ قومیت اور سائمن کمیشن کے مقاطعے کے ضمن میں اقبال کو تند و تیز اعتراضات کا ہدف بنایا۔ محمد علی جس راستے پر چلے اس کی منزل مایوسی اور خواری تھی۔ اسی لیے انھیں اپنا رویہ تبدیل بھی کرنا پڑا۔ صرف علامہ اقبال ہی کی بصیرت تھی جو درحقیقت مسلمانوں کے کام آئی۔ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے بغیر ہندوؤں سے اتحاد و تعاون کی حمایت کبھی نہ کی۔ اسلامی شخصیت اور اسلامی قومیت ان کے بنیادی نظریات تھے جن کی اقبال نے زندگی بھر آبیاری کی۔ وہ مغرب کی غالب اقوام کی ذہنیت سے خوب واقف تھے۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں جب محمد علی خلافت کا وفد لے کر یورپ گئے تو علامہ اقبال نے خلافت کی گدائی کو تاریخ سے آگہی کا فقدان قرار دیا۔[۲۲] چنانچہ سات ماہ کی ناکام کوشش کے بعد وفد واپس آ گیا۔

مسلمانوں کے لیے تحریکِ خلافت مذہبی مسئلہ تھی لیکن اس کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس طرح مسلم عوام گاندھی اور کانگرس کے قریب ہوئے۔ گاندھی نے اس تحریک میں شامل ہوکر وہ فائدہ اُٹھایا جو کسی اور طرح حاصل نہ ہوسکتا تھا۔[۲۳] خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مولانا محمد علی، ترکِ موالات کے سلسلے میں، علی گڑھ مہم سر کرکے لاہور پہنچے تاکہ اسلامیہ کالج کو بند کرایا جائے لیکن علامہ اقبال مزاحم ہوئے اور ترکِ موالات کو ٹال دیا۔[۲۴] اس رویے پر محمد علی شدت سے معترض ہوئے اور اقبال کو 'بے عمل' قرار دیا۔[۲۵]

محمد علی دو سال کی قید گزار رہے تھے کہ فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی نے، تحریکِ ترکِ موالات کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ ہندی قوم پرست مسلمان سخت الجھن میں پڑ گئے۔ محمد علی سزا کاٹ کر جیل سے باہر آئے تو ۱۹۲۴ء میں کانگرس سیشن کی صدارت کی۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کا عروج تھا۔[۲۶] لیکن ہندو مسلم اتحاد کمزور پڑ جانے سے ان کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کردیا، اس سے محمد علی کی حیثیت مزید متاثر ہوئی۔ بقول عظیم الشان صدیقی ''اس رشتے کے کمزور ہوتے ہی محمد علی کی

سیاسی حیثیت بھی اس حد تک کمزور ہونے لگی کہ لوگ ان سے چندے کا حساب مانگنے لگے۔"[۲۷]

ترکِ موالات کے خاتمے کے بعد ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ لاہور کے مئی ۱۹۲۷ء کے فسادات کے بعد علامہ اقبال نے مسلمانوں کو بار بار صبر و تحمل کی تلقین کی۔ محمد علی نے اس کی تعریف کی لیکن جب علامہ اقبال نے انتظامی عہدوں پر ہندوستانیوں کے بجائے انگریز افسروں کی تقرری کا مطالبہ کیا تو محمد علی کی نیند حرام ہوگئی۔ 'قوم پروری' [ہندی قوم پرستی] کے جوش میں علامہ اقبال کے خلاف ہمدرد میں یکے بعد دیگرے، پانچ مضامین شائع کیے۔ ان مضامین میں اقبال پر انگریز دوستی کا الزام عاید کیا گیا۔[۲۸]

اقبال نے ان مضامین کا کوئی جواب نہ دیا لیکن ۶/دسمبر ۱۹۲۸ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں اسلام کی حقانیت پر محمد علی نے ایک پُرتاثیر تقریر کی۔ اس اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ ان کا مختصر صدارتی خطبہ، ایک اعتبار سے، محمد علی کی ہندی قوم پرستی کا جواب تھا۔ اقبال نے کہا کہ اسلام نے اتحاد کی بنیاد روحانی رشتے پر رکھی ہے۔ میری رائے میں اس وقت اسلام کی قوتِ اتحاد و ارتباط کے لیے سب سے بڑی مزاحم قوت جغرافیائی قومیت ہے۔ اس لیے انسانیت کے سچے خادموں کا فرض ہے کہ وہ جغرافیائی قومیت کی مزاحمت کو دور کریں۔[۲۹]

نہرو رپورٹ تیار ہوئی تو مسلمان لیڈروں کے ایک گروہ نے اس کی مکمل حمایت کی۔ ابوالکلام اس گروہ میں شامل تھے۔ دوسرے گروہ نے ترامیم منظور کرانا چاہیں۔ جناح اس گروہ میں تھے۔ تیسرا گروہ رپورٹ کا مخالف تھا۔ اقبال اس میں شامل تھے۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے بھی رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا تاہم محمد علی، کانگرس کے سابق صدر کی حیثیت سے آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں شریک ہوئے۔ نہرو رپورٹ کے مخالف گروہ نے دسمبر ۱۹۲۸ء کے اواخر میں، دہلی میں، آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی۔ اس سے پہلے کلکتہ میں، آل پارٹیز کانفرنس میں، نہرو رپورٹ پیش ہو چکی تھی۔ محمد علی جوہر جب ترمیم پیش کر رہے تھے تو کانگرسی ارکان نے کھڑے ہو کر انھیں خاموش کرنا چاہا۔ مولانا ناراض ہو کر دہلی پہنچے اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شامل ہوگئے۔ اب وہ کانگرس سے بددل ہو چکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو اس میں شرکت کرنے سے قبل محمد علی جوہر نے مسلم مفادات کے تحفظ کی ضمانت چاہی۔ ضمانت نہ ملی تو سول نافرمانی کی تحریک سے الگ رہے۔[۳۰] یہ رویہ علامہ اقبال کی حکمت عملی کے مطابق تھا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے دوران، ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو، محمد علی جوہر نے، اپنی زندگی کی آخری تقریر کے آخر میں کہا:

> جہاں تک احکامِ خداوندی کے بجالانے کا تعلق ہے میں اوّل بھی مسلمان ہوں، دوم بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں... لیکن جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے... میں اوّل بھی ہندوستانی ہوں دوم بھی ہندوستانی

ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں۔ میں دو برابر کے دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں۔[۳۱]

محمد علی کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ متحدہ ہندوستان کی آزادی کی صورت میں دوسرا دائرہ پہلے دائرے پر حاوی ہو جاتا۔ احکامِ خداوندی پر ذاتی حیثیت سے عمل تو ہوتا، اسلام کی اجتماعی قوت بروئے کار نہ آسکتی۔ [اگرچہ ساٹھ برس بعد تک عملاً پاکستان بھی اس سے محروم ہے تاہم دستور میں اللہ کی حکمرانی طے ہو چکی ہے] علامہ اقبال ایک دائرے کے قائل تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ دوسرا [وطنی قوم پرستی کا] دائرہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔[۳۲] نقطۂ نظر کا یہ اختلاف محمد علی کے حامیوں کو علامہ اقبال پر تنقید کے لیے آمادہ کرتا رہا ہے۔ مولانا مدنی کے پیروکار بھی اپنے موقف کو تقویت پہنچانے کے لیے، ابوالکلام آزاد کے علاوہ، محمد علی جوہر کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔[۳۳]

۴

دینی علم، ایثار اور تقوے کے اعتبار سے مولانا حسین احمد مدنی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مسلم لیگ سے نکلنے کے بعد انھوں نے کانگرس کا ساتھ دیا، اور متحدہ وطنی قومیت کے علم بردار بن گئے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں صدر بازار دہلی میں، ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے، انھوں نے کہا:

موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ دیکھو انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی، پروٹسٹنٹ بھی، کیتھولک بھی، یہی حال امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ کا ہے۔[۳۴]

علامہ نے ''اپنی عمر کا نصف اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گزارا تھا،''[۳۵] انھوں نے مولانا مدنی کے بیان کی تردید زوردار انداز کے ساتھ کی:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است!
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است![۳۶]

اس طرح مسئلہ قومیت نے دو قابلِ احترام ہستیوں کے مابین ایک معرکے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ واقعات ۱۹۳۸ء کے ہیں۔ اس دوران کچھ وضاحتیں مولانا مدنی نے کیں اور ایک معرکہ آرا مضمون علامہ

اقبال کا شائع ہوا جواَب ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' کے عنوان سے مقالاتِ اقبال میں شامل ہے۔مولانا طالوت نے کوشش کی کہ اس نزاع کا خاتمہ ہوجائے اور علامہ اقبال مولانا مدنی کی پوزیشن صاف کر دیں۔ اس میں وہ کامیاب ہوگئے۔علامہ اقبال کی وفات کے بعد ارمغانِ حجاز شائع ہوئی تو مذکورہ اشعار اس میں موجود تھے۔مولانا مدنی بھی متحدہ قومیت اور اسلام نامی رسالہ مرتب کر رہے تھے جس پر اقبال کی وفات کے باعث کام روک دیا تھا لیکن ۱۹۳۹ء میں اسے شائع کر دیا۔[۳۷] اس میں انھوں نے اپنے موقف کی مزید وضاحت کی۔ چونکہ ہندی وطنی قومیت کی حمایت ایک کتاب کی صورت میں کی گئی تھی اس لیے مولانا حسین احمد مدنی ہندی قوم پرست مسلمان رہ نما کی حیثیت سے بہت نمایاں ہوگئے۔اس رسالے کی ابتدا میں وہ خط کتابت بھی شامل ہے جو مولانا طالوت نے دونوں اکابر سے کی تھی۔

مولانا عبدالرشید نسیم جن کا عربی تخلص طالوت تھا، دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔[۳۸] انھوں نے پہلے مولانا مدنی کو خط لکھا۔[اس خط کو خدا جانے کیوں متحدہ قومیت اور اسلام میں شامل نہ کیا گیا] مولانا مدنی نے اس خط کے جواب میں وہ باتیں لکھ دیں جو انھوں نے صدر بازار دہلی کے جلسے میں کہی تھیں۔ یہ ''وضاحت'' بھی کی کہ ''میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب وملت کا دارومدار وطنیت پر ہے، یہ بالکل افترا اور دجل ہے۔'' مولانا نے یہ بھی لکھا کہ ڈاکٹر اقبال نے ملت اور قوم کو مترادف سمجھ کر اعتراض کیا ہے، جو غلط ہے۔مولانا نے یہ اعتراض بھی کیا کہ ڈاکٹر اقبال نے غلط اخباری پروپیگنڈے کی بنا پر ''سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است'' کہہ دیا......اور اس سلسلے میں کوئی تحقیق نہ کی۔[۳۹]

مولانا مدنی نے اس خط میں واضح طور پر متحدہ وطنی قومیت کی تلقین کی۔فرماتے ہیں:

لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظّم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں، جس کی اساس محض وطنیت ہی ہوسکتی ہے۔اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگرس نے ابتدا ہی سے اس امر کو اپنے اغراض ومقاصد میں داخل کیا ہے۔[۴۰]

مولانا طالوت نے علامہ اقبال کے نام اپنے مکتوب میں مولانا مدنی کا یہ اہم اقتباس حذف کر دیا بلکہ ان کے خط کے تمام ایسے اندراجات حذف کر دیے جن پر اقبال کو اعتراض ہوسکتا تھا۔[۴۱] خط کے آخر میں مولانا طالوت نے علامہ اقبال کو لکھا:

یہ مولانا [مدنی] کی تقریر کے وہ اقتباس ہیں، جو میرے نزدیک ضروری تھے کہ آپ کی نظر سے گزر جائیں، جہاں تک میرا خیال ہے، مولانا کی پوزیشن صاف ہے اور آپ کی نظم کا اساس غلط پروپیگنڈے پر ہے۔ آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے قصور ہوں، تو مہربانی فرما کر، اپنی عالی ظرفی کی بنا پر، اخبارات میں ان کی

پوزیشن صاف فرمایئے، بصورتِ دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمایئے، تاکہ مولانا سے مزید تشفی کرلی جائے، ہمارے جیسے نیاز مند جو دونوں حضرات کے عقیدت کیش ہیں، دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہیں۔ امید ہے کہ باوجود عدیم الفرصتی کے ہمیں اس ورطۂ حیرانی سے نکالنے میں آیۂ رحمت ثابت ہوں گے۔[۴۲]

علامہ اقبال نے طالوت کے نام اپنے جواب میں لکھا:

مولوی صاحب نے یہ جو فرمایا ہے کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں، اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے، تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا، کیونکہ فرنگی ریاست کا نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر ان کا مقصود یہ تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کرلیں، تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی.... اگر مذکورہ بالا ان کا مقصد وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے، تو ان کے مشورے کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اُصولوں کے خلاف جانتا ہوں، میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایانِ شان نہیں اور مسلمانانِ ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔[۴۳]

مولانا مدنی نے طالوت کے نام اپنے دوسرے خط میں لکھا:

میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، یہ اس زمانے میں جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے، یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیے، خبر ہے انشا نہیں ہے، کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا، نہ امر اور انشا کا لفظ ذکر کیا ہے، پھر اس مشورہ کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔[۴۴]

وطنی قومیت کا مشورہ تو مولانا مدنی نے دیا تھا [طالوت کے نام ان کا پہلا خط انصاری میں شائع ہوگیا تھا] تاہم اقبال نے اپنی عالی ظرفی کی بنا پر [جس کی توقع اور خواہش طالوت کو بھی تھی] حسبِ ذیل بیان جاری کردیا جو ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ احسان میں شائع ہوا۔ اس بیان میں علامہ اقبال نے مولانا طالوت کی خواہش کہ 'ان کی پوزیشن صاف فرمایئے' پوری کردی۔ اقبال نے لکھا کہ:

مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار انصاری میں شائع ہوا، مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

لہٰذا اشد ضروری ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظّم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت اور کوئی رشتہ نہیں، جس کی اساس محض یہی [وطنیت] ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

ان الفاظ سے تو میں یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا ہے.... خط کے مندرجہ بالا الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔[۴۵]

اس طرح علامہ اقبال نے یہ مسئلہ عالی ظرفی اور خوش اُسلوبی کے ساتھ حل کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد مولانا مدنی کا رسالہ متحدہ قومیت اور اسلام شائع ہوا تو اس میں ''متحدہ قومیت'' کا مشورہ موجود تھا بلکہ متحدہ قومیت کی تلقین بار بار زوردار الفاظ میں کی گئی تھی۔ میثاقِ مدینہ سے اس کا اسلامی جواز بھی فراہم کیا گیا۔ ارمغانِ حجاز شائع ہوئی تو اس میں بھی مذکورہ اشعار شامل تھے۔ جو بحث ختم ہوگئی تھی وہ دوبارہ شروع ہوگئی اور تا حال جاری ہے۔ متعدد صاحبانِ علم نے مولانا مدنی کے مذہبی دلائل کا جواب لکھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے متحدہ قومیت اور اسلام کی تردید میں ایک کتابچہ مسئلہ قومیت کے عنوان سے شائع کیا۔ انھوں نے مولانا مدنی سے درخواست کی کہ اپنی غلطی تسلیم کر لیں اور ظالمانہ سیاست کو اسلامی ڈھال فراہم نہ کریں ورنہ آپ کی تحریریں فتنہ بن جائیں گی۔ جواباً سید مودودی کی تحریروں کو مرزائیت سے زیادہ خطرناک قرار دیا گیا۔[۴۶]

ہندی مسلمانوں نے قومیت کے ضمن میں مولانا مدنی کے بجائے علامہ اقبال کی پیروی کی اور پاکستان قائم ہوگیا۔ مولانا مدنی نے ہندوؤں اور سکھوں کی غارت گری دیکھی اور کانگرسی حکومت کی بے رخی کا سامنا بھی کیا[۴۷] لیکن اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حامی، ان کے دفاع میں، علامہ اقبال کی مخالفت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ تکیۂ کلام بن گیا ہے کہ ''مولانا مدنی نے قوم کا لفظ استعمال کیا تھا نہ کہ ملت کا'' ...... ''اقبال نے بلا تحقیق ملت از وطن است کا الزام عاید کر دیا'' ...... ''اقبال نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی تھی'' ...... مولانا مدنی کے ان ارادت مند حامیوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ریت کی دیوار پر کھڑے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن سواتی کا دعویٰ ہے کہ مولانا مدنی کا بیان اور اقبال سہیل کی نظم پڑھ کر ڈاکٹر اقبال نے اپنا بیان شائع کرایا کہ مجھ سے واقعی غلطی ہوئی ہے۔ مجھے غلط خبر پہنچی تھی۔ اب اصل حقیقت مجھ پر منکشف ہوگئی ہے۔ اس لیے میں مولانا مدنی سے معافی کا خواست گار ہوں۔ امید ہے مجھے مولانا صاحب معاف فرمائیں گے۔[۴۸] اصل بات یہ ہے کہ مولانا مدنی کے ایک حامی اور ارادت مند مولانا طالوت نے، مولانا مدنی کے لیے، علامہ اقبال سے این اوسی قسم کا بیان شائع کروایا اور دوسرے حامی وارادت مند مولانا سواتی نے اسے ''معافی کی درخواست'' قرار دے دیا۔ مولانا صاحبان کی تحقیق کا یہ معیار افسوس ناک ہے۔

مولانا حسین احمد نجیب اور آگے گئے ہیں۔ انھوں نے اقبال کو ان شعرا میں شامل کیا ہے جن کی قرآن نے مذمت کی ہے۔[۴۹] مکتوباتِ شیخ الاسلام کے مرتب مولانا نجم الدین اصلاحی لکھتے ہیں کہ ہم ڈاکٹر صاحب کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں۔[۵۰] اقبال شکنی کی ان کوششوں کے پس منظر میں، ظاہر ہے کہ ''عصبیتِ شیخ'' کارفرما ہے۔

ہندی قوم پرست مسلمان ہندو حکمرانوں کے ہاتھوں عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بقول ڈاکٹر

محمد ہاشم قدوائی ایک طرف انھیں اپنے ہم مذہبوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان کے ہندو کانگرسی رفقا ان سے بالعموم بے اعتنائی برتتے۔ ڈاکٹر انصاری جو کانگرس کے صدر بھی رہے، اس بے اعتنائی کا شکار ہوئے۔[۵۱] مرار جی ڈیسائی نے ابوالکلام آزاد سے نہایت تلخ اور درشت لہجے میں کہا کہ ''آپ کی جگہ ہندوستان میں نہیں پاکستان میں ہے اور جس قدر جلد آپ چلے جائیں آپ کے لیے بہتر ہوگا''۔[۵۲] بقول پروفیسر مشیرالحق India wins freedom کے ۳۰ صفحات کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد کو ''فرقہ پرست'' کہا گیا اور ان کے ماضی کے ہر بیان کو جھوٹ کا پٹارا ثابت کیا جا رہا ہے۔[۵۳] مولانا مدنی سے کانگرسی حکومت کی بے رخی اور بے التفاتی کا ذکر قاضی محمد زاہدالحسینی نے چراغ محمدؐ میں کیا ہے۔[۵۴]

۵

مولانا ظفر علی خاں کا معاملہ مخالفتِ اقبال کے محرکات کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس [۱۹۰۶ء] میں وہ شریک تھے۔ قراردادِ لاہور [۱۹۴۰ء] کے سلسلے میں بھی ان کا اہم کردار تھا۔ اقبال وظفر کے رجحانات و مقاصد مشترک تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے مداح اور دوست تھے۔ ۱۹۲۷ء میں شاہی مسجد لاہور میں علامہ اقبال کی تقریر کے دوران حاضرین نے شور مچایا تو اقبال نے ان کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے تقریر ختم کر دی۔ ظفر علی خاں نے اپنی تقریر کے دوران معترضین کے رویے کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

> کیا میں آپ سے عرض نہ کروں کہ آپ نے ڈاکٹر اقبال کے حضور گستاخی کی ہے یعنی ان کی تقریر کے دوران اعتراض کیا۔ اقبال پکا مسلمان اور سچا عاشقِ رسول ہے.....

اس پر آوازیں بلند ہوئیں کہ ہم ڈاکٹر صاحب سے معذرت چاہتے ہیں۔ یہ گستاخی کسی مسلمان نے نہیں کی۔[۵۵] اقبال کی وفات پر ظفر نے کہا:

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا[۵۶]

یہی مولانا ظفر علی خاں ۱۹۲۷ء کے بعد ۱۹۳۱ء بلکہ ۱۹۳۷ء تک علامہ اقبال کے خلاف بیان بازی کرتے، اشعار موزوں کرتے اور فکاہات کے عنوان سے کالم لکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ علامہ اقبال تو ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۷ء تک وہی تھے جو ۱۹۲۷ء تک تھے — پھر وہ بُرے [انگریزوں کے کاسہ لیس اور آزادی کی قبر کھودنے والے] کیسے ہوگئے؟ وجہ دراصل یہ ہے کہ خود ظفر علی خاں کے سیاسی رجحانات ادلتے بدلتے رہے۔ جداگانہ انتخاب، سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ کے معاملے پر اقبال اور ظفر کا سیاسی اختلاف تھا۔ اس اختلاف نے مخالفت کی شکل اختیار کر لی۔ مخلوط انتخاب کی حمایت میں ظفر کہتے ہیں:

ان محرمانِ سرِّ ازل کے خیال میں
اسلام کی ہے شرط جداگانہ انتخاب
مخلوط انتخاب کو منظور تو کرو
ہوتے ہی رائج اس کے سب اُٹھ جائیں گے حجاب[57]

سائمن کمیشن دونوں کے مابین شدید اختلاف کا باعث بنا۔ اقبال کا خیال تھا کہ اگر کمیشن کو مسلمانوں کے موقف سے آگاہ نہ کیا گیا تو مسلمان گھاٹے میں رہیں گے۔ ظفر علی خاں کانگریسی نقطۂ نظر کی حمایت کر رہے تھے اور کمیشن کے بائیکاٹ کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک کمیشن کے حامی سرکار کے کاسہ لیس تھے:

کمیشن سے تعاون کرنے والے یہ تو فرمائیں
کہ آخر اس خوشامد کا صلہ ان کو وہ کیا دے گا
نئی عزت ملے گی کون سی ان کاسہ لیسوں کو
وہ کس سرخاب کے پر ان کی ٹوپی میں لگا دے گا[58]

سائمن کمیشن کی مخالفت میں کانگرس، خلافت کمیٹی اور جناح لیگ متحد تھیں۔ ظفر علی خاں جو ابھی تک کانگرس میں بھی شامل تھے، کہتے ہیں:

زوال اسلامیوں کا اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا
کہ جو ان کا تھا وہ انگریز کا اقبال ہوجائے
خلافت، کانگرس اور لیگ کا ایکا یہ کہتا ہے
کہ اُلٹی آسمانِ پیر کی ہر چال ہوجائے[59]

یہی نہیں بلکہ ۴؍فروری ۱۹۲۸ء کی ایک نظم میں اقبال کو رجعت پسند، آزادی کا مخالف اور قوم کی لٹیا ڈبونے والا قرار دیتے ہوئے یہ زہرناک اشعار کہے:

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے، سر اقبال نے
کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے
قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے[60]

سائمن کمیشن کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ اس میں کوئی ہندوستانی شامل نہ کیا گیا تھا۔ وزیرِ ہند نے طنزاً کہا کہ ہندوستانی مدبرین خود کوئی متفقہ دستور کیوں مرتب نہیں کر لیتے چنانچہ نہرو رپورٹ تیار ہوئی۔ ہندو متفقہ طور پر اس کے حامی تھے۔ مسلمان رہ نماؤں کے تین گروپ بن گئے نیشنلسٹ مسلم پارٹی نے رپورٹ کی

حمایت کی۔ اس میں ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری شامل تھے۔[61] جناح لیگ نے ترمیمیں پیش کیں جنھیں مسترد کر دیا گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی، بمبئی لیگ اور لاہور لیگ نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔

جعفر بلوچ کا اندازہ ہے کہ ظفر علی خاں نے کانگرس سے استعفیٰ ۱۹۳۱ء میں دیا، اگرچہ ہندو مسلم اتحاد کا ساز ان کے ہاں تادیر بجتا رہا۔ حسبِ ذیل اشعار ۵/ دسمبر ۱۹۴۰ء کے ہیں:

اگر جینا کا دل آ جائے گاندھی جی کی مٹھی میں
تو غیروں کی غلامی سے وطن آزاد ہو جائے
رواداریِ کامل کے ہر اک مندر میں چرچے ہوں
ہر اک مسجد جو اَب ویران ہے آباد ہو جائے[62]

جعفر بلوچ لکھتے ہیں کہ مسلم زعما میں سے صرف علامہ اقبال ہی ایسے دیدہ ور تھے جن کی دانشِ ایمانی نے ہندو ذہنیت اور اس کی دام گستری سے کبھی دھوکا نہ کھایا۔[63] علامہ اقبال کے راستے پر آتے آتے ظفر علی خاں نے کافی وقت لیا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں مجلسِ اتحادِ ملت قائم کی جسے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔[64] اسی سال مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ہندو سیاست کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اب بدل گیا تھا۔ ۷/ستمبر ۱۹۳۷ء کی ایک تقریر کے دوران انھوں نے ہندوؤں سے کہا کہ مسلمانوں کو کچلنے کے ارادے سے باز آ جاؤ۔ اب وہ دوقومی نظریے کی پرزور حمایت کرنے لگے۔[65] تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلے میں شاعری بھی ہوتی رہی۔ بعض اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔ ایک شعر اور ایک مصرع درج کیے جاتے ہیں:

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اُٹھتی آندھی ہے

عزم ہمارا ٹل نہیں سکتا بن کے رہے گا پاکستان[66]

مولانا ظفر علی خاں نے ہندی قوم پرست مسلم رہ نما کی حیثیت سے علامہ کی مخالفت کی اور ان پر طرح طرح کے الزامات عاید کیے لیکن پاکستانی شعور کے تحت اور تحریکِ پاکستان کے رہ نما کی حیثیت سے اقبال کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

۶

آزاد بھارت میں، نیشنلسٹ مسلمان، علامہ اقبال کے حوالے سے مخمصے کا شکار ہیں۔ ہندو دانش وروں کی طرح، ان کے بھی دو بڑے گروہ ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد دعوے کرتے ہیں۔ ایک گروہ نظریۂ

قومیت اور تصور پاکستان کی بنا پر اقبال کو سخت تنقید کا ہدف بناتا ہے۔ دوسرے گروہ کا دعویٰ ہے کہ تصورِ پاکستان سے اقبال کا کوئی تعلق نہیں۔ دلچسپ لیکن عبرتناک صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک نیشنلسٹ مسلمان بڑے طمطراق سے اقبال پر 'فرقہ پرستی' اور 'تقسیمِ ملک' کے حوالے سے معترض ہوتا ہے اور کوئی ہندو اہلِ قلم اسے منہ توڑ جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اقبال پر مذہبی فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی حمایت کا الزام بے بنیاد، گمراہ کن اور بہتان ہے اور یہ کہ اقبال کا تصورِ پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کا ایک بلند آہنگ مضمون بعنوان 'مشترکہ تہذیبی ورثہ اور اقبال' فروری ۱۹۹۶ء کے کتاب نما میں بطور 'اشاریہ' شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۹۳۰ء کے قریب جب اقبال کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان کی عملی سیاست میں داخل ہوتے ہیں تو گروہی عصبیت اور فرقہ واریت کے تنگ دائروں سے نکل کر اور مشترکہ تہذیبی میراث کی پاسبانی کرنے کے بجائے، اپنے فکری منصوبے کے تحت مسلمانوں کے اکثریتی علاقے شمال مغربی ہند میں ایک آئیڈیل اسلامی ریاست کی تعمیر کے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں....اس ظالمانہ کارروائی کے نتیجے میں پورے برصغیر میں انسانیت کس کس طرح لہو میں غلطاں ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی، اگر ہمارے شاعرِ مشرق کو خواب میں بھی اس کا خیال آ گیا ہوتا تو وہ صرف سیدھی سیدھی شاعری کرتے۔ اپنے عہد کی مذموم سیاست میں گرفتار ہونے، مذہبی فرقہ پروری اور علیحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی حمایت کے سبب زندگی کا جو منشا بنا شاید وہ آج قدرے مختلف ہوتا۔[۶۷]

اس مضمون کے جواب میں رام پرکاش کپور ''مطالعۂ اقبال'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

فروری ۱۹۹۶ء کے کتاب نما میں، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب کا اشاریہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا، بلکہ ذہنی کوفت ہوئی۔ آج کل علامہ اقبال کے خلاف لکھنے اور ان پر تقسیمِ ملک اور اس کے نتائج کی ذمہ داری ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان پر مسلم بنیاد پرستی کو ہوا دینے اور اپنے عہد کی مذموم سیاست میں گرفتار ہونے، مذہبی فرقہ پروری اور علیحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی حمایت کا الزام لگانے کا چلن کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے...علامہ اقبال پر یہ الزامات اور خاص طور پر ''مذہبی فرقہ پروری اور علیحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی حمایت'' کا الزام سراسر بے بنیاد، گمراہ کن اور بہتان ہے۔...غلط فہمی کا منبع علامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں دیا گیا خطبۂ صدارت ہے۔ لیکن اس خطبہ میں علامہ اقبال نے آزاد پاکستان کی نہیں بلکہ انڈین فیڈریشن کے اندر ایک مسلم اکثریت کے صوبہ کی وکالت کی تھی۔ جسے توڑ موڑ کر لوگوں نے آزاد پاکستان کے تصور کے طور پر پیش کر دیا۔ آزاد پاکستان کا تصور علامہ اقبال کے دماغ کی اپج نہیں تھی بلکہ انگریز کی ایک چال تھی۔[۶۸]

پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو غیر مستحکم کرنے کے لیے یہ موقف کارآمد ہے کہ آزاد پاکستان کا تصور علامہ

اقبال نے پیش نہیں کیا بلکہ یہ انگریز کی چال تھی۔ اس طرح کی غلط بیانیوں کا ایک جال بچھایا گیا ہے۔ چنانچہ ہندو سیاست دانوں اور دانش وروں کی پیروی میں ہندی قوم پرست مسلمان بھی یہ موقف اپنا رہے ہیں کہ علامہ اقبال کا تصورِ پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ہندی قوم پرستوں میں آل احمد سرور، مظفر حسین برنی اور متعدد دوسرے دانش ور شامل ہیں۔ ان دانش وروں کی آرا کا ذکر کرنے سے پہلے ایک ہندی قوم پرست مسلمان عالم کا تذکرہ ضروری ہے جن کا علامہ اقبال پر یہ اعتراض ہے کہ اقبال نے تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا تصور دیا اور یہ اقبال کی غلط رہ نمائی تھی۔

مولانا وحید الدین خاں نے بڑی تعداد میں کتابیں اور کتابچے لکھے ہیں اور ان کی تصانیف بھارت اور پاکستان میں عام طور پر دستیاب ہیں۔[۶۹] ان کے دو مضامین پر، بھارت میں، اچھی خاصی بحث ہوئی۔ ان مضامین کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

۱- زمانہ کو پہچانیے - ملک و بیرون ملک کے مسلمانوں کے اندازِ فکر کا جائزہ

۲- اقبال کی شاعری سے امت ٹس سے مس ہوئی یا نہیں؟ اقبال کا راستہ منزل کی جانب ہی نہ تھا۔

ان تحریروں کے جواب میں متعدد مضامین شائع ہوئے۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے مجلّے اقبال ریویو میں مولانا کے مضامین اور متعدد جوابی مضامین نومبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شامل کر دیے گئے۔ وحید الدین خاں پہلے مضمون میں لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک مسلم دنیا میں سیکڑوں کی تعداد میں مسلم قائدین اُٹھے جن میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے سیاسی اقتدار کو سب سے زیادہ اہمیت دینا۔ جمال الدین افغانی، عبدالرحمٰن الکواکبی، سید قطب، علامہ اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی سب کے سب سیاسی اقتدار کو اہم ترین چیز سمجھتے تھے۔ یہ واضح طور پر مسلم قیادت کی ذہنی پسماندگی کی علامت ہے۔ ان لوگوں کا ذہن دورِ زراعت میں بنا اور وہ اپنی فکر کو دورِ صنعت تک نہ پہنچا سکے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ امریکی یہودیوں، ہندوستانی پارسیوں اور انڈونیشیا کے چینیوں کی اقتصادی ترقی پر توجہ مبذول کریں۔ اس مشورے کے بعد وحید الدین خاں لکھتے ہیں:

> مولانا شبیر عثمانی، علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح اگر اس حقیقت کو جانتے تو وہ ملک کی تقسیم کی کبھی حمایت نہ کرتے کیونکہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے یہ موقع تھا کہ ایک پورے برِاعظم میں وہ ہر قسم کی تعلیمی، اقتصادی، صحافتی اور دعوتی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں جبکہ تقسیم کے نتیجے میں وہ سمٹ گئے اور ان تمام عظیم اور وسیع امکانات سے یکسر محروم ہو گئے۔ اسی محرومی کی قیمت میں انھیں جو چیز ملی وہ صرف دو چھوٹے چھوٹے خطہ ارضی میں محدود سیاسی اقتدار تھا اور بس۔[۷۰]

دوسرے مضمون کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے:

اصل حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی راہنمائی ہی درست نہ تھی۔ انھوں نے جس راستہ پر قوم کو دوڑایا وہ منزل کی جانب جانے والا راستہ ہی نہ تھا... برصغیرِ ہند کے مسلمانوں کے مسائل کا حل جغرافیہ کی تقسیم نہ تھا بلکہ خود مسلمانوں کو تعلیم و ترقی کے راستے میں آگے بڑھانا تھا....اقبال کا کیس غلط راہنمائی کا کیس ہے نہ کہ راہنمائی کو قبول نہ کرنے کا کیس۔[۱]

برعظیم، بعض محدود ادوار سے قطع نظر، کبھی ایک ملک نہیں رہا لیکن ہندوؤں کی طرح ہندی قوم پرست مسلمان دانش ور اور علما اس واضح حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مولانا وحید الدین خاں دوسرے نیشنلسٹ علما سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ انھیں علامہ اقبال کے علاوہ جمال الدین افغانی، عبدالرحمٰن الکواکبی، سید قطب اور ابوالاعلیٰ مودودی سبھی گم کردہ راہ دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے امکانات سیاسی اقتدار [آزادی] کی بدولت زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے مدینہ میں آزاد اسلامی ریاست قائم کی تھی جس میں بالادستی اللہ کے احکام کو حاصل تھی۔ اسلام کا یہ اجتماعی سیاسی نظام آزادی کے بغیر بروئے کار نہیں لایا جا سکتا اور اگر آزادی کی کوئی وقعت نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ ہندوؤں نے اس کے لیے جدوجہد کیوں کی؟

آلِ احمد سرور سرکردہ استاد، بلند پایہ نقاد، مشہور دانش ور اور معروف اقبال شناس ہیں۔ اقبال پر اہم کتب کے مرتب و مصنف ہیں۔ ان کا معرکہ آرا مضمون ''اقبال اور اس کے نکتہ چین'' پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں اُردو اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا، تاہم وہ بھارت میں ہندو مسلم متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر میں سرگرمی دکھانے پر مجبور ہو گئے اور اس تناظر میں اقبال پر اعتراضات بھی کیے۔ وہ علامہ اقبال کو تصورِ پاکستان کا خالق بتاتے تھے لیکن برنی کی تنقید کے بعد اپنا موقف تبدیل کر دیا۔ دانش ور اقبال میں اقبال کو تصورِ پاکستان سے لاتعلق قرار دیا ہے۔ اقبال کے اسلامی قومیت کے نظریے کو ہندی قومیت کی شکل میں ڈھالنا محال ہے تاہم اسلام کی، اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تاویل سے بھارتی مسلمانوں میں متحدہ قومیت کا پرچار کیا جا سکتا ہے اور آلِ احمد سرور نے یہی کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہندوستانی مسلمان جب ہندوستانی قومیت کی طرف بڑھتے ہیں تو ان کا اسلام کا تصور ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں واضح کرنا ہے کہ حقیقی اسلام، قومیت [ہندی قومیت] کے فروغ میں کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔[۲]

آلِ احمد سرور وطنی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ قومیت کا لفظ قومیت [Nationalism] ہی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اپنی دانش وری کے زور سے قومیت کو اسلام سے فائق بتاتے ہیں:

قومیت آج دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے... اس دور کے ذہن کی کنجی قومیت ہے... اسلام ہمیں

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ممتاز اور علیحدہ کرتا ہے، قومیت ہمیں ان سے ملاتی ہے...قومیت صرف جغرافیہ کی مرہونِ منت نہیں۔ اس میں تاریخ، تہذیب، اقتصادی مفاد کی وحدت بھی ضروری ہے اور سب سے زیادہ یگانگت کے احساس کی۔ قومیں مذہب سے نہیں بنتیں، وطن اور اس کی مشترک تاریخ وتہذیب سے بنتی ہیں۔[۳]

آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ''دراصل اقبال نے مارکس کی طرح قومیت کی طاقت کا پورا اندازہ نہیں کیا تھا....اقبال نے لفظ نیشن [Nation] کے سلسلے میں دقت نظر سے کام نہیں لیا۔''[۴] مسئلہ قومیت کے سلسلے میں آل احمد سرور اقبال پر بار بار معترض ہوتے ہیں اور بار بار ابوالکلام آزاد کا موقف بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں:

یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ اقبال نے جغرافی حدود یا وطنیت یا قومیت کی قوت اور اہمیت سے انکار کرکے غلطی کی۔ اقبال نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جس کی طرف مولانا آزاد نے اپنی کتاب *India Wins Freedom* کے آخر میں اشارہ کیا ہے یعنی یہ کہ اوّلین دو صدیوں کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمانوں کے لیے مرکز اتحاد نہیں بن سکا۔[۵]

آل احمد سرور کا المیہ یہ ہے کہ انھیں یہ شکایت بھی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ہم وطنوں سے جو کسی دوسرے مذہب کے پیرو ہیں، ذہنی طور پر اتنے قریب نہیں جتنے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ہیں۔[۶] اقبال کے نظریۂ اسلامی قومیت پر تنقید اور فکرِ اقبال کی عظمت پر شک ہندوستانی قومیت کی استواری کے لیے ضروری خیال کرتے ہوئے آل احمد سرور اقبال کو دانش ور تو مانتے ہیں، بڑا مفکر تسلیم نہیں کرتے۔[۷] پاکستان کی فکری بنیاد پر ہندوؤں ہی کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں اور سوال اُٹھاتے ہیں کہ ''کیا یہ بات غلط ہے کہ پاکستان کا وجود ہندوستانی مسلمانوں کی کاوش سے زیادہ مغربی استعمار پرستوں کی ایک سیاسی مصلحت کا مرہونِ منت ہے؟''[۸] اس کے ساتھ وہ یہ فیصلہ بھی سناتے ہیں کہ اقبال کو پاکستان کے نظریے کا خالق کہنا میرے نزدیک صحیح نہیں۔ اس موقف کو وہ بار بار دہراتے ہیں۔[۹] سرور نے جناح کے نام لکھے گئے اقبال کے خطوط کو بھی مشکوک ٹھہرا دیا ہے۔ دانش ور اقبال کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں کہ ''ان خطوط کی اصل کہیں دستیاب نہیں۔''[۸۰]

سید مظفر حسین برنی اہم مناصب پر فائز رہے ہیں۔ اس میں متعدد صوبوں کی گورنری شامل ہے۔ ان کی تصنیف محبِ وطن اقبال ان کے خطبے ''اقبال اور قومی یکجہتی'' کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دیباچے میں برنی نے لکھا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے ہندوستان کے ادبی وفکری ماحول میں اقبال کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محب وطن اقبال ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی جبکہ بھارت میں اقبال صدی تقریبات،

بڑے پیمانے پر ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے آزادی کے کچھ عرصہ بعد، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی بحالی کے لیے شعرِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر اجاگر کرنا شروع کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں عام خیال یہ تھا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد پر ہے، اس وجہ سے اقبال کو خاموش طریقے سے نظر انداز کیا جا رہا تھا۔[۸۱] پروفیسر آزاد نے اقبال کا رشتہ تصورِ پاکستان سے کاٹنے کی کوشش نہیں کی اور نہ قیامِ پاکستان کو، آل احمد سرور کی طرح غلطی[۸۲] قرار دیا۔ تاہم اقبال کے ہندوستانی پس منظر کو مناسب طریقے سے اجاگر کر کے بھارت میں اقبال کی بحالی میں اہم کردار ادا کیا۔ سید مظفر حسین برنی نے بھی اقبال کو ''بحال'' کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اقبال کے تصورِ اسلامی اتحاد کو پرفریب امید قرار دے کر اور تصورِ پاکستان سے اقبال کو لاتعلق ظاہر کر کے۔[۸۳] یہ ہندوستان کی سرکاری پالیسی ہے۔ اصل حقیقت وہی ہے جسے جگن ناتھ آزاد نے ہندوؤں کا 'عام خیال' کہا ہے۔

پروفیسر مشیر الحق کی تصنیف اقبال – ایک مسلم سیاسی مفکر ان کی صاحبزادی ماہ طلعت علوی نے مرتب کر کے ۱۹۹۶ء میں شائع کی۔ پروفیسر موصوف کو، آل احمد سرور کے الفاظ میں ''کشمیر میں کچھ دہشت پسندوں نے اپریل ۱۹۹۰ء میں اغوا کر لیا اور پھر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا''۔[۸۴] اس افسوس ناک واقعے سے کچھ عرصہ پہلے انھوں نے یہ موقف پیش کیا تھا کہ پاکستان اقبال ہی کا تصور ہے۔[۸۵] لیکن قبل ازیں مصلحتاً اقبال کا رشتہ تصورِ پاکستان سے کاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔[۸۶] یہی مصلحت انھیں فکرِ اقبال کی عظمت گھٹانے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اصل اقبال شاعری میں نہیں، خطبات اور خطوط میں ہے۔ خطبات میں بھی اصل اہمیت چھٹے خطبے، اجتہاد، کی ہے۔ اس خطبے سے ان کے مذہبی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ان مذہبی خیالات کو علما ناپسند کرتے ہیں۔[۸۷]

اس سے پہلے اسی طرح کا استدلال ایس حسن احمد نے کیا تھا۔ ان کی انگریزی کتاب اقبال، ان کے سیاسی تصورات چوراہے پر ۱۹۷۹ء میں، علی گڑھ سے، شائع ہوئی۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اقبال کے نقوش انمٹ ہیں لیکن ان کے سیاسی بیانات اور دلائل کے لیے شاعری درست ذریعہ نہیں ہے [تصورات کی جگہ ''بیانات اور دلائل'' کے الفاظ لائے ہیں] اقبال کے سیاسی تصورات کو سمجھنے کے لیے ان کی نثر کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ [شاعری برطرف] نثر میں سیاسی خیالات کم کم پیش ہوئے ہیں [ایسا نہیں ہے] اس لیے تھامپسن کے نام خطوط کی بہت اہمیت ہے۔ [باقی ماندہ نثر بھی موقوف] اقبال نے ان خطوط میں تصورِ پاکستان، جمہوریت، مذہب اور ہندوستانی سیاست پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ [ان سب موضوعات پر اقبال کی اُردو فارسی شاعری سمیت مضامین، خطبات اور بیانات نیز دوسرے خطوط میں بھی اظہارِ خیال موجود ہے۔ ان سب مآخذ کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔]

پہلے باب میں حسن احمد نے تھامپسن کے نام اقبال کے تین خطوط کے اقتباسات پیش کیے ہیں، جن میں سے دوسرے خط میں، اقبال نے، اپنی الہٰ آباد کی تجویز کو ''مسلم صوبے کی تخلیق'' کہا ہے۔ پوری کتاب کی تصنیف کا باعث دراصل اقبال کا یہی جملہ ہے جسے 'نئی شہادت' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان 'تصورِ پاکستان' ہے۔ حسن احمد نے اقبال کے خطوط بنام تھامپسن، خطبۂ الہ آباد [۱۹۳۰ء] اور خطبۂ لاہور [۱۹۳۲ء] کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ 'پاکستان سکیم' اقبال کی نہیں تھی۔ وہ صرف ہندوستان کے اندر ایک مسلم صوبے کی تجویز تھی۔

عتیق صدیقی کی تصنیف اقبال – جادو گر ہندی نژاد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ ضمیموں کے طور پر شیخ عبدالقادر اور محمد علی جوہر کے مضامین شامل کر لینے کے باوجود یہ مختصر سی کتاب ہے لیکن اس میں، اقبال پر، خاصا معترضانہ مواد جمع کیا گیا ہے۔ عتیق صدیقی نیشنلسٹ ہی نہیں اشترا کی ذہن بھی رکھتے ہیں، اس لیے اقبال شکنی کا جذبہ دو آتشہ ہو گیا۔ انھوں نے تحقیق سے زیادہ اپنی غرض و غایت کو پیش نظر رکھا ہے اور ان اغراض کے حصول کے لیے مخصوص حربوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ اقبال سوشلسٹ تھے لیکن خوف زدہ ہو کر اس سے لاتعلقی ظاہر کر دی بلکہ اس کی مخالفت کی۔[۸۸] عتیق صدیقی کے دوسرے تحقیقی نتائج حسبِ ذیل ہیں:

۱- اقبال دہری شخصیت کے مالک تھے۔[۸۹]
۲- اقبال اور شبلی کم و بیش ایک ہی زمانے میں عطیہ فیضی کے دامِ الفت میں گرفتا ہوئے۔[۹۰]
۳- اقبال نہ فلسفی تھے، نہ شرع کے ماہر اور نہ عملی سیاست دان۔[۹۱]
۴- اتحادیوں کے جشنِ فتح میں شریک ہو کر نظم سنانا اور خطاب یافتگی برطانیہ پرستی کا ثبوت ہے۔[۹۲]
۵- خلافت اور آزادیِ ہند کی مشترکہ تحریک میں حصہ نہ لے کر مشکوک ٹھہرے۔[۹۳]
۶- خطبہ الہ آباد، پاکستان کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔[۹۴]

ہندوستان میں نیشنلسٹ مسلمان بہت ہیں۔ ان میں جمیل مظہری شامل ہیں جنھیں علامہ جمیل مظہری کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی میں، ۱۶ نومبر ۱۹۷۹ء کو، اقبال صدی تقریبات کے افتتاحی اجلاس میں اقبال کی تصویر کی نقاب کشائی کی تھی۔ جمیل مظہری نے اپنے خطبے کے دوران کہا کہ میں خود شاعری میں اقبال کا پیرو ہوں لیکن ان کے دو قومی نظریے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ اسے ہندوستان ہی کے لیے نہیں پوری دنیا کے لیے زہرناک سمجھتا ہوں۔ میں فن میں ان کے نقشِ قدم کو چوم چوم کے چلتا رہا لیکن مذہبی و سیاسی حیثیت سے میں ابوالکلام کے مدرسۂ فکر کا طالب علم ہوں۔ اقبال کی شاعری میں قومی منافرت کا کڑوا زہر ہے، ایک زہریلا سانپ پھن مار رہا ہے، اس سے اپنے ذہنوں کو ڈسوایئے نہیں۔[۹۵]

اس سے پہلے، اقبال سیمی نار منعقدہ لکھنؤ میں انھوں نے ''دو اقبال'' کے عنوان سے مضمون پیش کیا۔ اس میں بتاتے ہیں کہ مفکر ہونے کی حیثیت سے اقبال کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ انھوں نے دنیا میں، مذہب کی بنیاد پر، ایک قومیت کی تشکیل چاہی۔ اقبال ملی شاعر بھی ہے اور آفاقی شاعر بھی۔ ملی شاعر کی حیثیت سے وہ جنگ کا اور آفاقی شاعر کی حیثیت سے امن کا حامی ہے۔ اقبال بیک وقت تیرگی اور روشنی کا شاعر ہے۔ اقبال میں تضاد ہے۔ ہمیں اس اقبال کو نظر انداز کر دینا چاہیے جو تیرگی کا ترجمان ہے۔[۹۶]

حوالے و حواشی

۱- عام طور پر خطبۂ علی گڑھ کا سال ۱۹۱۰ء لکھا ہوا ملتا ہے۔ اصغر عباس نے اپنے مونوگراف بعنوان سرسید، اقبال اور علی گڑھ میں اس خطبے کی تاریخ ۹رفروری ۱۹۱۱ء بتائی ہے۔[صفحہ ۳۸] اصغر عباس کا تعلق چونکہ شعبۂ اُردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ہے اور فلیپ پر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ اصغر عباس نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور دوسرے ذرائع سے یہ مواد اکٹھا کیا ہے اس لیے یہ تاریخ، بظاہر، قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن خود آل احمد سرور کا دعویٰ ہے کہ یہ خطبہ مئی ۱۹۱۰ء میں دیا گیا تھا[نقد و نظر، جلد ۶ شمارہ ۱] بنیادی ماخذ کا حوالہ کسی نے نہیں دیا۔

۲- سید حسن ریاض لکھتے ہیں کہ ۵رفروری ۱۹۲۲ء کو گورکھ پور کے قریب موضع چوراچوری میں کانگرس کا جلوس نکلا۔ تھانے میں ۲۱ کانسٹیبل تھے اور ایک سب انسپکٹر تھا۔ جلوس والوں نے اور اس مجمعے نے جو جلوس کے ساتھ ہو گیا تھا، تھانے میں آگ لگا دی۔ تھانے کے سب آدمی جل کر مر گئے۔ بائیس آدمیوں کی ہلاکت تحریک ترکِ موالات کے خاتمے کا باعث بن گئی۔[پاکستان ناگزیر تھا، ناشر: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص۱۲۴]

۳- تفصیلات کے لیے دیکھیے، پروفیسر مشیر الحق کا مضمون بعنوان ''حزب اللہ- مولانا آزاد کی انقلابی کتابِ حیات کا ایک ورق'' مشمولہ ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت، مرتبہ: رشید الدین خاں۔

۴- دیکھیے: تلاش و تعبیر، رشید حسن خاں، ص۲۹۔

۵- ابو الکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت، ص۵۹، ۸۵۔

۶- قاسم سید، جامعہ کی کہانی، ص۱۵ بحوالہ ابوالکلام آزاد- ایک تقابلی مطالعہ، ص۶۸۔

۷- ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون بعنوان ''اقبال اور ابوالکلام کے ذہنی فاصلے''، مشمولہ مسائل اقبال اور مولانا غلام رسول مہر کے دو مضامین بعنوان ''علامہ اقبال اور مولانا آزاد'' مشمولہ اقبالیات از مولانا غلام رسول مہر قابلِ مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ نے دونوں اکابر کی دوریوں اور غلام رسول مہر نے

دونوں کی قربتوں پر روشنی ڈالی ہے۔

۸- ابوالکلام کے 'وحدتِ ادیان' کے تصور کے لیے دیکھیے: ادبی تناظر از راج بہادر گوڑ، ص۶۵۔ میثاق مدینہ کے تناظر میں متحدہ قومیت کے دعوے کے لیے دیکھیے: (i) ابوالکلام کا ۱۹۲۱ء کا خطبہ بحوالہ ابوالکلام آزاد—ایک ہمہ گیر شخصیت، ص۱۰۰ (ii) مولانا حسین مدنی کا ۱۹۳۸ء میں شائع ہونے والا رسالہ متحدہ قومیت اور اسلام، ص۶۱-۶۷۔

۹- دیکھیے: چراغ محمد، مرتبہ: قاضی محمد زاہد الحسینی، ص۵۹۹۔

۱۰- ابوالکلام آزاد— ایک ہمہ گیر شخصیت، ص۵۵۲۔

۱۱- ۱۹۲۱ء میں آگرے کی مجلسِ خلافت میں خطبہ دیتے ہوئے ابوالکلام آزاد نے کہا:

الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا۔ کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا...... ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرضِ شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہوجائیں۔[ابوالکلام آزاد— ایک ہمہ گیر شخصیت، ص۴۴۸]

واضح رہے کہ ۱۹۱۲ء میں ہندوؤں مسلمانوں کے اتفاق کی بات کی تھی، دو قوموں کا ''اتفاق''— لیکن ۱۹۱۲ء میں ایک قوم بننے کی تلقین کر رہے ہیں۔ ایک غیر دینی قومیت کی نظریاتی بنیادیں استوار کرنے کے لیے 'فرضِ شرعی' کا سہارا بھی لے رہے ہیں۔

۱۲- بحوالہ موجِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص۲۵۵۔

۱۳- ایم ثناءاللہ، خطباتِ ابوالکلام آزاد، ص۱۳۔

اس زمانے میں اقبال اور ابوالکلام کی پرواز ایک ہی فضا میں تھی۔ اقبال نے ۱۹۰۶ء میں کہا تھا:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

[ابتدائی کلامِ اقبال، اردو ریسرچ سنٹر، حیدر آباد، ۱۹۸۸ء، ص۲۹۶، بانگِ درا، ص۱۴۴]

ابوالکلام کا بیان اور علامہ اقبال کا یہ شعر کس قدر مشابہ ہیں:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

[ترانۂ ملی، بانگِ درا]

۱۴- ابوالکلام آزاد-ایک ہمہ گیر شخصیت، ص۳۹۸۔

۱۵- تفصیل کے لیے دیکھیے: کتاب مذکور، ص۴۵۴-۴۵۵۔

۱۶- ابوالکلام آزاد نے India wins Freedom میں لکھا ہے کہ مسلم ممالک صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہیں ہوسکتے۔ ایسی بات کہنا لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب ہے۔ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بنا پر مسلمان ملکوں کو ایک ریاست میں منسلک کرنے میں ناکام رہا[بحوالہ تقسیمِ ہند، عبدالوحید خاں، ص۱۴]۔

۱۷- موجِ کوثر، ص۲۹۶۔

۱۸- ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ابوالکلام کے اس بیان کی بنیاد پر کہ ''ہندو ہونا یا مسلمان ہونا، ان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے، جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔'' بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس سے سیکولرزم کی بنیاد پڑتی ہے۔[ادبی تناظر، ص۶۶]

۱۹- موجِ کوثر، ص۲۷۳۔

۲۰- دیکھیے: مولانا وحیدالدین خاں کی آرا، مشمولہ اقبال ریویو، حیدر آباد، نومبر ۱۹۹۵ء، ص۳۴ تا ۳۷ اور ۵۲ تا ۵۵۔

۲۱- چند ہم عصر، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص۱۰۶۔

۲۲- دیکھیے: دریوزۂ خلافت - بانگِ درا، دو اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی!

۲۳- تفصیل کے لیے دیکھیے: ''محمد علی جوہر: ایک جذباتی رہ نما''، مشمولہ تلاش و تعبیر، رشید حسن خاں۔

۲۴-۲۵ دیکھیے: مضامینِ محمد علی، حصہ دوم، مرتبہ: محمد سرور، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص۴۲۵-۴۳۶۔

۲۶-۲۷ عظیم الشان صدیقی، اظہارِ خیال، ص۱۳۳، ۱۳۵۔

۲۸- مضامینِ محمد علی، ص۴۲۴-۴۷۵۔

۲۹- حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، مرتبہ: محمد حمزہ فاروقی، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۵۔

۳۰- اس تبدیلی کی روشنی میں محمد علی کا سابقہ رویہ اور اقبال پر اعتراضات سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔

۳۱- بحوالہ چراغ محمد، ص۵۹۹-۶۰۰۔

۳۲- وضاحت کے لیے دیکھیے: (i) نظم بعنوان 'وطنیت' مشمولہ بانگِ درا، نیز (ii) ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' مشمولہ مقالاتِ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۳۳- مثال کے طور پر دیکھیے، چراغ محمد، مرتبہ: محمد زاہد الحسینی، ص۵۹۹۔

۳۴- مولانا حسین احمد مدنی، متحدہ قومیت اور اسلام، ص۴...... نیز دیکھیے، چراغ محمد، ص۵۹۰۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا مدنی یورپی نیشنلزم کے نظریے کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس نظریے کی تردید علامہ اقبال گزشتہ تیس بتیس برس سے کر رہے تھے۔ ابتدا ۱۹۰۶ء کے اواخر یا ۱۹۰۷ء کے اوائل میں اس شعر سے ہوئی تھی:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

۳۵- دیکھیے: طالوت کے نام، علامہ اقبال کا دوسرا خط، کتابِ مذکور، ص۱۸۔

۳۶- نظم 'حسین احمد'، ارمغانِ حجاز (حصہ اُردو)۔

۳۷- متحدہ قومیت اور اسلام، ص۲۹۔

مولانا مدنی لکھتے ہیں: ''بالآخر جب کہ میں قومیت کی لفظی بحث کے اختتام پر پہنچ کر مقصد اصلی سے نقاب اُٹھانا چاہتا تھا، ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کے وصال کی خبر شائع ہوگئی۔ طبیعت بالکل بجھ گئی اور عزائم فسخ ہوگئے۔ احباب کے تقاضے پریشان کر رہے تھے...... ضروری معلوم ہوا کہ میں اپنی معلومات اور خیالات کو ضرور بالضرور ملک کے سامنے پیش کردوں۔''

۳۸- ماہنامہ الرشید، مدنی و اقبال نمبر، جامعہ رشیدیہ، ساہیوال، پاکستان، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۷۸ء، ص ۴۵۲۔

۳۹- اپنے بیان میں متحدہ وطنی قومیت کی جو تلقین مولانا مدنی نے کی تھی اور جو ان کے پہلے خط بنام طالوت میں موجود ہے، اقبال کی مذکورہ نظم کی بنیاد ہے۔ یہ نظم کسی غلط پروپیگنڈے کی اساس پر نہیں کہی گئی۔ اقبال 'قوم اور ملت' کا لفظ بطور مترادف گزشتہ تیس برسوں سے استعمال کر رہے تھے۔ مثلاً ع بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے اور ع خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی......

۴۰- مولانا مدنی کا یہ خط متحدہ قومیت اور اسلام [صفحات ۳ تا ۱۱] میں درج ہے۔

۴۱- محذوف اقتباسات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ از عمر حیات خاں غوری، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۹۱۔

۴۲ تا ۴۵- متحدہ قومیت اور اسلام، صفحات [بالترتیب] ۱۴-۱۵، ۱۷-۱۸، ۲۰، ۲۳-۲۴۔

۴۶- دیکھیے: مسئلہ قومیت، ص ۱۰۷ نیز چراغ محمد، ص ۳۷۴۔

۴۷- دیکھیے: چراغ محمد، ص ۴۳۰۔

۴۸-۴۹- الرشید، مدنی و اقبال نمبر، ص ۳۱۱، ۳۲۹۔

۵۰- مکتوباتِ شیخ الاسلام، جلد سوم، ص ۱۴۱-۱۴۲۔

۵۱- اُردو بک ریویو، نئی دہلی، جولائی اگست ۱۹۹۸ء، [پروفیسر مشیر الحسن کی کتاب مختار احمد انصاری پر تبصرہ]، ص ۱۳۔

۵۲- India wins Freedom کا انتساب مرار جی ڈیسائی کے نام ہے۔ منقولہ جملہ انتسابی تحریر میں شامل ہے۔

۵۳- اقبال—ایک مسلم سیاسی مفکر، نئی دہلی، بھارت، ۱۹۹۶ء، ص ۷۹۔

۵۴- چراغ محمد، ص ۴۳۰۔

۵۵-۵۷- جعفر بلوچ، اقبال اور ظفر علی خاں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، صفحات [بالترتیب] ۴۷، ۱۰۷، ۱۴۷۔ جعفر بلوچ کے بقول ''ہم دیکھتے ہیں کہ طریقِ نیابت کے اس تنازع میں وقت نے بالآخر حضرت علامہ اقبال کے حق میں فیصلہ دیا اور انھی کا نقطۂ نظر معتبر ٹھہرا۔''

۵۸-۶۰- ایضاً صفحات [بالترتب] ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۱-۱۱۲۔

۶۱- ایضاً، ص ۱۱۷۔ تاہم ۱۲ مئی ۱۹۲۹ء کو ظفر علی خاں نے لکھا کہ میں نہرو رپورٹ کا ان ترمیمات کے ساتھ حامی ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ دہلی میں منظور ہوئیں۔ اس سے پہلے نہرو رپورٹ کی حمایت میں باغ موچی دروازہ لاہور میں مولانا ظفر علی خاں اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی۔ ان پر خشت باری کی گئی اور دونوں زخمی ہوئے۔ [دیکھیے، کتاب مذکور، ص ۱۲۱]

۶۲-۶۵- ایضاً صفحات [بالترتیب] ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۴۲، ۱۴۷۔

۶۶- ایضاً، ص ۱۴۷، ۱۵۶۔

۱۹۳۹ء کے دوران نیشنلسٹ علما کے سلسلے میں ظفر علی خاں نے کہا:

رسول اللہؐ کے گھر میں یہ کیا انقلاب آیا
کہ گاندھی جی کی کٹیا، عالمانِ دیں کا ڈیرا ہے

خدا ہی جانتا ہے حشر اس ٹولی کا کیا ہوگا
حرم سے جس کی بدبختی نے رخ ملت کا پھیرا ہے

[اقبال اور ظفر علی خاں،ص۱۴۹]

۶۷- یہ نقشہ اس طرح مختلف ہوتا کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے آزاد علاقے بھی ہندو تسلط کے تحت ہوتے اور جہاں کہیں مسلمان آزاد ہونا چاہتے، وہ کشمیری مسلمانوں کی طرح، مرکزی مسلح افواج کے مظالم کا شکار بنتے۔ ہندو احیا پرستی کے مقابلے میں بقول ٹیگور اگر مسلمان خاموش رہتے، ہندوؤں کے تابع مہمل بن کر رہتے اور اپنی ہستی کو متحدہ ہندی قومیت میں فنا کر دیتے تو ہندو اور سکھ وہ قتل و غارت گری نہ کرتے جو ۱۹۴۷ء میں انتقاماً روا رکھی گئی۔ اس غارت گری کا مقصد یہ بھی تھا کہ قیامِ پاکستان ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے۔

۶۸- کتاب نما،مئی ۱۹۹۶ء،ص۵۲،۵۳،۵۵۔

۶۹- مولانا کی تصانیف کے ترجمے عربی، انگریزی، ہندی، انڈونیشی، ترکی اور یوگوسلاوی وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔ حکومتِ پاکستان کے تحت کتبِ سیرت کے مقابلے میں ان کی کتاب پیغمبرِ انقلاب کو پہلا انعام مل چکا ہے۔ [ہندوستان کے اُردو مصنفین اور شعرا،ص۵۷۹-۵۸۰]۔

۷۰- اقبال ریویو،نومبر ۱۹۹۵ء،ص۳۶۔

مسلمان قائدین نے اسلامی ریاست پر زور دیا جس میں مسلمانوں کی فلاح مضمر ہے۔ مولانا نے یہ بات نظر انداز کی ہے کہ امریکہ اور یورپ کے یہودیوں کی سب سے بڑی خواہش اسرائیلی سلطنت کا قیام تھا۔ علاوہ ازیں یہودیوں نے اقتصادی ترقی سودی کاروبار کی بنیاد پر کی۔ کیا مسلمانوں کو ایسا کرنا چاہیے؟ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے قیام سے بھارتی مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ کیوں؟ اگر ان کے ہاتھ میں وسائل نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ وسائل ہندوؤں کے قبضے میں ہیں۔ وہ وسائل پاکستان منتقل نہیں ہوئے۔ اگر پاکستان اور بنگلہ دیش قائم نہ ہوتے تو متحدہ ہندوستان میں، ان آزاد خطوں کے وسائل بھی ہندوؤں ہی کے قبضے میں ہوتے۔

۷۱- ایضاً،ص۵۵۔

مولانا کا نقطۂ نظر صداقت سے عاری ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اقبال کی رہ نمائی پر عمل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو، بڑی حد تک، نظر انداز کیا گیا ورنہ پاکستان اس قدر مضبوط ہوتا کہ بھارت کشمیری مسلمانوں پر اس قدر ظلم نہ کر سکتا اور نہ ہندوستان کے مسلمان کس مپرسی کا شکار ہوتے۔

۷۲- آل احمد سرور،فکر روشن،ص۹۰۔

۷۳- ایضاً،ص۸۹،۹۲۔ آزاد بھارت کا باشندہ ہونے کے باعث آل احمد سرور کے قدم لڑکھڑا گئے اور انھوں نے مشترکہ [ہندو مسلم] ہندی قومیت کے نعرے کو شعار بنالیا۔ اپنے مشہور مضمون ''اقبال اور اس کے نکتہ چین'' میں سرور نے وطنی قومیت کو بے وقت کی راگنی اور اسلام کو عالمگیر تحریک قرار دیا تھا۔ [عرفان اقبال،ص۷۵] اب وہ خدا جانے کس مشترک تاریخ و تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ اور تہذیب مشترک نہیں ہیں بلکہ متصادم ہیں۔ اورنگ زیب اور سیوا جی کے علاوہ بابری مسجد اور رام مندر اس کی مثالیں ہیں۔ صرف اُردو ہندو مسلم تہذیب کی مشترکہ زبان تھی لیکن ہندوؤں نے اُردو کی جگہ ہندی اختیار کر لی اور بھارت میں اُردو کو محدود کیا جا رہا ہے۔

۷۴-۷۵- دا نش ور اقبال، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱، ۸۳۔

۷۶- فکرِ روشن، ص ۸۷۔

۷۷- دا نش ور اقبال، ص ۸۔

۷۸- فکرروشن، ص ۹۰۔

۷۹- مثال کے طور پر دیکھیے: دا نش ور اقبال، ص ۹، ۲۳، ۱۱۳؛ فکر روشن، ص ۲۵۔
نیز اقبال ایک مسلم سیاسی مفکر مصنفہ: پروفیسر مشیر الحق، تعارف، ص ط۔

۸۰- جون ۱۹۹۷ء میں اقبال اکیڈمی دہلی کی طرف سے، پاکستانی اقبال شناسوں کے اعزاز میں دیے گئے استقبالیے میں اپنے خطاب کے دوران ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ یہ بات آل احمد سرور سے پہلے میں نے کہی تھی۔ اس دعوے کو ہم نے دلائل سے رد کر کے انھیں خاموش کرا دیا۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے، اقبالیات، جولائی-ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۵-۱۶۶]

۸۱- عبدالقوی دسنوی، ہندوستان میں اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۔

۸۲- فکر روشن، ص ۸۴۔

۸۳- محبِ وطن اقبال، ص ۴۰، ۱۴۵-۱۴۶۔
ہندوستان میں اقبال کی حمایت ومخالفت عرصے سے جاری تھی۔ آزاد بھارت میں ان کی بحالی کے ضمن میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے لکھا ہے کہ پورا مشرق اقبال کو عصرِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہے اس لیے وہ ہندوستان میں کسی بحالی کے محتاج نہیں ہیں۔ [تنویرِ اقبال، ص ۲۸۷]

۸۴-۸۷- اقبال—ایک مسلم سیاسی مفکر، (i) تعارف (ii) صفحات [بالترتیب] ۱۰-۱۴، ۴۳-۴۸، ۸۰۔

۸۸- تفصیل کے لیے دیکھیے: اقبال— جادو گر ہندی نژاد، ص ۱۰۱-۱۰۲۔

۸۹- کتاب مذکور، ص ۹۔

۹۰- ایضاً، ص ۴۵۔

۹۱- ایضاً، اقبال شرع کے ماہر نہیں تھے۔ یہ سوال اُٹھانے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟ اقبال نے کسی دینی ادارے میں مولویوں والا نصاب نہیں پڑھا تھا تاہم مولویوں سمیت وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے فکری رہنما ہیں۔ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی اور اسلامی شریعت سے بھی آگاہ تھے۔ اقبال فلسفی تھے یا نہیں یہ سوال الگ سے بحث طلب ہے۔

۹۲- ایضاً، ص ۷۷، ۹۳-۹۹۔

۹۳- ایضاً، ص ۹۳۔

۹۴- ایضاً، ص ۱۵-۱۶۔

۹۵- دیکھیے: رموز اقبال، مرتبہ: ظفر اوگانوی، کلکتہ یونی ورسٹی، ۱۹۸۴ء، ص ۹-۱۰۔

۹۶- ''مطالعہ اقبالؔ''، مشمولہ مقالاتِ اقبال سیمی نار منعقدہ لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۲۲-۱۳۳۔